بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اگست ۱۹۹۱ میں جماعتِ اسلامی کے قیام کے پچاس سال پورے ہو جائیں گے ' اگرچہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس سے بھی تقریباً ۱۵ سال قبل جماعتِ اسلامی کے نصب العین اور قیام کی دعوت کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ مرکزی مجلسِ شوریٰ نے یہ طے کیا ہے کہ پچاسویں سال کے موقع کی مناسبت سے جماعتِ اسلامی کی دعوت زیادہ زور شور سے پیش کرنے' عوام میں اسے وسیع پیمانے پر روشناس کرانے' اور خود جماعت میں نئے ولولہ اور یکسوئی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھنے کا عزم بیدار کرنے کے لیے خصوصی تقریبات کا اہتمام کیا جائے۔

ہم گزشتہ پچاس سالوں میں کن کن مراحل سے گزرے' کیا کیا رکاوٹیں راستے میں پیش آئیں' ہم نے کیا کیا پیش قدمیاں کیں' یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس داستان کی تاریخ بعض احباب نے لکھی ہے' اور کچھ لکھی جارہی ہے۔ میں اس وقت' مجلسِ شوریٰ کے فیصلہ کے تحت منعقد کی جانے والی پچاس سالہ تقریبات کے موقع کی مناسبت سے' ماضی و حال کی روشنی میں' یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم آج کس مرحلہ میں ہیں' ہمیں کیا چیلنج درپیش ہیں' ہم ان کا مقابلہ کس طرح کر رہے ہیں' اور آئندہ ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تقریباً سارا عالمِ اسلام مغربی تہذیب اور مغربی سامراج کے تسلّط میں تھا۔ اس کا اکثر حصّہ ' برِّصغیر سمیت' براہِ راست برطانیہ کی مضبوط گرفت میں تھا۔ اسلام کا نام بھی تھا' مذہبی مراسم بھی ادا کیے جاتے تھے' دینی دعوت و تعلیم بھی جاری تھی' لیکن دین

کے اس تصوّر کا شعور خال خال لوگوں میں پایا جاتا تھا کہ اس کا قیام ہی ہر مسلمان کا انفرادی طور پر' اور امّتِ مسلمہ کا بحیثیت مجموعی' مقصدِ حیات ہے۔ بحیثیت ایک جامع نظامِ زندگی کے بھی دین کا تصوّر اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دین کے قیام کے لیے جدّوجہد میں زندگی کے آثار بھی مفقود تھے۔ ان حالات میں پورا عالمِ اسلام مایوسی اور افسردگی کا شکار تھا۔

برّصغیر کے مسلمان' آٹھ سو سال حکومت کرکے' انگریز کی غلامی میں جا چکے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ' خلافت تحریک کی ناکامی' ہندو سامراج کی ریشہ دوانیاں' پہلے انتخابات کے نتیجہ میں قائم ہونے والی اکثریتی ہندو حکومتوں کے مظالم--- ان سب عوامل کے نتیجہ میں برّصغیر کے مسلمانوں پر مایوسی اور افسردگی کے زیادہ ہی گہرے سائے چھائے ہوئے تھے۔

مایوسی کے اس عالم میں کچھ علماء ضرور مسلمانوں کو دین کی طرف دعوت دے رہے تھے' علامہ اقبالؒ نے بھی امید کی ایک شمع روشن کر رکھی تھی' لیکن ان سب کا کام' زیادہ تر صرف پیغام تک محدود تھا۔ ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر' اقامتِ دین کا جھنڈا اُٹھا کر' منظّم جدّوجہد کی راہ پر قدم اُٹھانے کے لیے حوصلہ' ہمّت اور آمادگی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔

ان حالات میں' خالص دین کی بنیاد پر مسلمانوں کی صف بندی کرنے کے لیے عملی تحریک برپا کرنے کی سعادت مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ کے حصّے میں آئی۔ اُنھوں نے نہ صرف مغربی تہذیب کا طلسم توڑا' اسلام کا تصوّر بحیثیت ایک جامع نظامِ زندگی کے اجاگر کیا' بلکہ اسلام میں جہاد کا مقام اور اس کی اہمیت کا احیاء کیا۔ مولانا مودودیؒ نے مسلمانوں کو پکارا کہ جن حالات سے ان کو سابقہ درپیش ہے' ان حالات میں اقامتِ دین "فرضِ کفایہ نہیں بلکہ فرضِ عین ہوتا ہے' اور ہر وہ شخص قابلِ مواخذہ ہو گا جو قدرت واستطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے لیے جان لڑانے سے گریز کرے گا۔" ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ "احکامِ کفر کے مقابلہ میں احکامِ الٰہی کے اجرا کی کوشش بہرحال اجتماعی جدّوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کے لیے جماعت کا وجود' اور جو جماعت موجود ہو اس کا التزام' ضروری ہے۔" (رسائل و مسائل' چہارم)

اُنھوں نے کھول کھول کر یہ بات سمجھائی کہ اقامتِ دین کا مقصد ہی وہ اصل مقصد ہے جس کی خاطر انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ یہی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد تھا۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (الفتح:۲۸)

اور یہی امّتِ مسلمہ کا اصل مقصد اور فریضہ ہے۔ امّت کے ہر فرد پر فرض ہے کہ وہ

فریضۂ اقامتِ دین کی اس منظم جدّوجہد میں اپنا حصّہ ادا کرے' اور اس کے لیے اپنے آپ کو یک جماعتی نظم کے سپرد کر دے۔

کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تومنون باللہ
(آل عمران:۱۱۰)

و کذالک جعلنکم امتہ وسطا" لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا
(البقرہ: ۱۴۳)

اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچنے کے لیے ' اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ بھی یہی ہے کہ ایک مومن اپنی پوری زندگی اور وسائل اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے جہاد میں لگا دے۔

یہی وہ دو باتیں تھیں جنھوں نے بے شمار سعید رُوحوں کو مضطرب کر دیا' انہوں نے مولانا مودودیؒ کی پکار پر لبیک کہا' اور ۲۶ اگست ۱۹۴۱ کو لاہور میں جماعتِ اسلامی قائم ہو گئی۔

پچاس سال پہلے اگرچہ چند ہی رفقاء سفر اکٹھے ہوئے' وہ بھی اکثر متوسّط درجہ کے بے وسائل نوجوان' لیکن مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ سفر اس یقین کے ساتھ شروع کیا کہ ایک وقت آئے گا کہ سرمایہ داری نظام کو واشنگٹن اور لندن میں اور اشتراکیت کو ماسکو میں پناہ نہیں ملے گی۔ اسلام کو نظامِ غالب بنانے کی یہ تحریک بظاہر بے سرو سامانی کی حالت میں شروع کی گئی۔ لیکن اس کا اصل سرمایہ چند مومن افراد کا اخلاص تھا' اور یہ ایمان تھا کہ حق بذاتِ خود ایک قوت ہے۔ ان کو یقین تھا کہ جب اہلِ حق اخلاص کے ساتھ راہِ حق میں نکلتے ہیں تو اللہ کی نصرت آتی ہے' اور فیصلہ کرنے والی ذات خود اللہ ربّ العالمین ہے۔ اگر صالحین کا ایک ایسا گروہ وجود میں آجائے جو اس کے راستے میں مخلصانہ جدّوجہد کرکے ثابت کر دے کہ وہ زمین کی وراثت کی صلاحیت رکھتا ہے' تو اللہ تعالیٰ دنیا کی زمامِ کار مفسدین سے اس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

ہم سب سے پہلے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہیں کہ پچاس سالوں میں مولانا مودودیؒ کا قائم کردہ قافلۂ حق کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ ۱۹۴۱ کے اجتماع میں اگر ۷۵ افراد تھے' اور ۱۹۶۳ میں تقریباً سات ہزار' تو ۱۹۸۹ میں تقریباً ۷۰ ہزار افراد جماعتِ اسلامی کے کل پاکستان

اجتماع کے لیے جمع ہوئے۔ انتخابات کا طریقہ ہی' ارکان کے اجتماعِ عام کے فیصلے کے مطابق' وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اپنا اصل مقصد--- زمامِ کار کی تبدیلی یا انقلابِ امامت--- حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان انتخابات کے نتیجہ میں اگر ایک وقت ہماری قوت صفر تھی' تو آج ہم پارلیمانی زندگی میں ایک مضبوط قوت کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کوئی کم بڑی بات نہیں کہ ایک لادین اور سوشلسٹ قیادت کو ہم نے انتخابات ہی کے ذریعہ سے اقتدار سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ۱۹۴۹ کی قرار دادِ مقاصد' ۱۹۵۶ اور ۱۹۷۳ کے اسلامی دستور' اور ۱۹۹۱ کے شریعت بل بلاشبہ ایسے اقدامات ہیں جن کے نتیجہ میں مطلوبہ روئیدگی نمودار نہیں ہوئی' اور اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آیا' لیکن ان اقدامات نے' جمہوری ذرائع سے اور کشت و خون کے بغیر' پاکستان کو کس طرح اسلامی ریاست کے راستہ سے باندھ دیا' اور اس راستہ پر کتنا آگے بڑھا دیا' اس کا اندازہ ترکی' مصر' شام و عراق اور انڈونیشیا جیسے ممالک کو دیکھ کر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

معاشرہ میں بگاڑ بڑھا ہے' لیکن ہماری اصلاح و تعمیر اور دعوت کی سرگرمیوں کے بغیر یہ معاشرہ کہاں پہنچ چکا ہوتا' اس کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ہماری دعوت کے نتیجہ میں لاکھوں افراد نہ صرف اپنی زندگیاں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق گزارنے میں لگے ہوئے ہیں' بلکہ عملاً معاشرے کو' دعوت کے صبر آزما کام کے ذریعہ' اسلامی بنانے کے لیے اپنا جان و مال لگا رہے ہیں۔ آج آپ کسی شعبۂ زندگی میں چلے جائیں' آپ کو جماعتِ اسلامی کی دعوت کے اثرات نظر آجائیں گے۔ ملک ہی نہیں' آپ دنیا کے کسی حصّہ میں جائیں' وہاں اسلام کے لیے جدّوجہد کرنے والوں میں اقامتِ دین اور تحریکِ اسلامی کے حوالے سے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ کو معروف اور محترم و مکرم پائیں گے۔ ہر جگہ براہِ راست جماعتِ اسلامی کے وابستگان کو متحرک پائیں گے۔ بنگلہ دیش میں پارلیمنٹ میں توازنِ قوت جماعتِ اسلامی کے ہاتھ میں ہے۔ کشمیر میں ہندوستان کی غلامی سے آزادی کی جدّوجہد میں جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے۔ برطانیہ' یورپ اور امریکہ میں جماعت سے وابستگان کی منظّم جماعتیں کام کر رہی ہیں۔

یہ جو کچھ حاصل ہوا ہے' محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوا ہے۔ اس پر ہم اس کا جتنا شکر ادا کریں' وہ کم ہے جو کچھ نہ ہو سکا' جتنا ہم منزل سے دور ہیں' وہ سراسر ہماری کمزوریوں اور خامیوں کا نتیجہ ہے۔ اس پر ہم جتنا استغفار کریں' حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو گا۔ لیکن

سب سے بڑھ کر جس چیز کا شکر ہم پر واجب ہے اور جو چیز‘ یہ ساری دنیاوی کامیابیاں نہ بھی حاصل ہوتیں تو بھی‘ ہماری اصل متاع اور حاصل جدّوجہد ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو بنیادی مقاصد‘ قرآن وسنّت کی روشنی میں‘ آج سے پچاس سال پہلے‘ ہم نے اپنے لیے متعیّن کیے تھے‘ ہم انہی مقاصد کی طرف چل رہے ہیں۔ اور اسی طریقِ کار کے مطابق چل رہے ہیں جو ہم نے قرآن و سنّت کی روشنی میں پچاس سال پہلے اپنے لیے وضع کیا تھا۔

انفرادی لغزشوں اور غلط فیصلوں سے انسانوں کی کسی جماعت میں مفر نہیں۔ حالات میں تغیّرات کے مطابق پالیسی‘ نظام‘ تدابیر‘ وسائل اور تکنیک میں تبدیلیاں بھی کی جاتی رہی ہیں‘ اور ۱۹۴۷ ہی سے کی جاتی رہی ہیں‘ لیکن یہ تبدیلیاں انہی اصولوں کی روشنی میں کی جاتی رہی ہیں جو قرآن و سنّت سے ثابت ہیں‘ جن کی توضیح خود بانیٔ جماعت نے فروری ۱۹۵۷ میں ماچھی گوٹھ میں ارکان کے اجتماعِ عام میں کی تھی‘ اور جن کی تصویب ارکانِ جماعت نے کر دی تھی۔ قرآن و سنّت کے منصوص احکام کو تبدیل کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں‘ اور جو جماعت اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے اُٹھے اس کے لیے تو یہ لازم ہے کہ وہ اسی طریقِ کار سے اپنی منزل کی طرف بڑھے جو طریقِ کار رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ آپؐ کی طے کردہ حدود کے اندر رہے‘ جن چیزوں سے آپؐ نے روکا اُن سے رکی رہے‘ اور جن وسعتوں اور جس تنوّع کو آپؐ نے اختیار کیا یا اجازت دی‘ ان میں اجتناب اور تنگی اختیار کرنے سے احتراز کرے۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں‘ اور یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے‘ کہ ہم آج ۱۹۹۱ میں وہی الفاظ بلا تامّل دہرا سکتے ہیں جو الفاظ بانیٔ جماعت نے ۱۹۵۷ میں ارشاد فرمائے تھے۔ یہ الفاظ جماعت کے ان چند لوگوں کو مخاطب کرکے کہے گئے تھے جو خود مولاناؒ کی تحریروں سے مولاناؒ کے خلاف یہ مقدمہ قائم کر رہے تھے کہ ۱۹۴۷ کے بعد جماعت نے اُن کی قیادت میں پالیسی اور تدابیر میں جو تبدیلیاں کی ہیں‘ اور جو تیز تر عوامی اور سیاسی جدّوجہد شروع کر دی ہے‘ اس کی وجہ سے وہ اپنے اس اصل طریقِ کار سے ہٹ گئی ہے جس کی خود اُنھوں نے تعلیم دی تھی۔ دینی احکام میں حکمتِ عملی کے نام پر تبدیلی کر دی گئی ہے‘ ترمیم و تحریف کا اختیار حاصل کر لیا گیا ہے‘ جماعت کا اخلاقی و دینی معیار گر گیا ہے۔ اُنھوں نے فرمایا:

> انفرادی لغزشوں اور کوتاہیوں سے تو بہرحال کوئی جماعت خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اجتماعی حیثیت سے جماعتِ اسلامی ان اصولوں کی پوری پابندی کرتی رہی

ہے (جو عقیدہ، نصب العین، شرائط رکنیت اور مستقل طریقِ کار کے تحت دستور میں درج کیے گئے ہیں)...

جماعتِ اسلامی ابتدا سے ایک سوچے سمجھے نقشے پر کام کر رہی ہے۔ اس نقشے کی تفصیلات تو ہمارے ذرائع وسائل کی ترقی کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہیں، لیکن اس کے بنیادی خطوط وہی رہے ہیں جو اول روز سے اس کام میں ہمارے پیش نظر تھے (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۹-۷۳)

جماعتِ اسلامی اگر اپنے نصب العین اور بنیادی اصولوں پر قائم رہی ہے تو یہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل، قرآن و سنّت کی طرف رجوع اور اُن کے التزام کی سعی، اور مولانا مودودیؒ کی بصیرت سے بھرپور رہنمائی ہی کا نتیجہ ہے۔

جماعتِ اسلامی نے اپنے لیے جو طریقِ کار کتاب اللہ اور سنتِ نبویؐ سے اخذ کیا وہ چار بنیادی اصولوں یا معالم و حدود پر مبنی تھا۔

۱۔ خدا اور رسولؐ کی ہدایت کا پابند رہنا۔

۲۔ لوگوں کو، انفرادی اور اجتماعی طور پر، وسیع سے وسیع پیمانہ پر، اللہ کی طرف بلانا، یعنی دعوت الی اللہ۔

۳۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں، اُن کا تزکیہ و تربیت کرنا اور اُنھیں منظم کرنا، یعنی تربیت و تنظیم۔

۴۔ اس منظم گروہ کو اصلاح معاشرہ اور انقلابِ امامت کے لیے جدّوجہد کے کام میں مصروف عمل کرنا، تاکہ ہر شعبۂ زندگی میں اللہ کا دین غالب ہو، یعنی جہادِ فی سبیل اللہ۔

خلافِ صداقت و دیانت ذرائع کے استعمال سے اجتناب، اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری و آئینی طریقوں سے کام کرنا، رائے عامہ کے ذریعے مطلوبہ تغیرّات بروئے کار لانا، کھلم کھلا اور عَلانیہ کام کرنا --- غور کیا جائے تو یہ سب اصول درج بالا چار اصولوں ہی کا منطقی نتیجہ ہیں، انھیں سے مستنبط ہیں۔

اس کام کے لیے معقول اور فطری طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف دعوت دینے والا سب سے پہلے خود اپنے آپ سے ابتدا کرے ۔ وہ اپنی زندگی میں تضادات کو دور کرنے ، اللہ کے رنگ

میں اپنے آپ کو رنگ دینے' اور خود اپنی دعوت کا نمونہ بن جانے کی مسلسل کوشش میں لگ جائے۔ ساتھ ہی وہ اپنے گھر اور اہل وعیال' اعزّہ و اقربا اور اپنے ہمسایوں تک یہ دعوت پہنچائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ پوری قوم کو اور عالمِ انسانیت کو (حسبِ استطاعت) اللہ کی طرف دعوت دے' اور اصلاحِ معاشرہ' تبدیلیٔ حکومت اور انقلابِ قیادت کے لیے بھی مقدور بھر کام کرے۔ ان میں سے کوئی کام کسی دوسرے کام کی خاطر نہ ملتوی کیا جا سکتا ہے' نہ مؤخر۔ نہ اسے ترک کیا جا سکتا ہے۔ ہاں' کمی بیشی اور تقسیم کار ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا فرض ہے کہ نظمِ جماعت اس سے جو کام لینا چاہے اور جہاں اسے لگانا چاہے' وہ پوری وفاداری سے اپنی صلاحیتیں اس کے سپرد کردے۔

نظمِ جماعت کے لیے' ابتدا سے قرآن و سنّت کی روشنی میں جو اصول وضع کیے گئے ان میں سمع وطاعت فی المعروف' مشاورت' باہمی الفت و محبت اور احتساب اہم ترین اصولوں کے طور پر شامل تھے۔

ان اصولوں اور اس نقشۂ کار کی پابندی جس طرح روزِ اول سے کی جارہی ہے آج بھی کرنا ضروری ہے۔ بلکہ آج زیادہ ہی ضروری ہے۔ آج ہمیں سنگین تر چیلنجوں سے سابقہ درپیش ہے۔ ہماری تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ معاشرے کا بگاڑ بھی بڑھ گیا ہے۔ دنیا ایک آنگن بن گئی ہے' اور تحریکِ اسلامی ایک عالمگیر حقیقت۔ اب اس کے دشمن اپنے ملک ہی میں نہیں ہیں' بلکہ غالب سامراجی قوتیں بھی اس کے درپے ہیں۔ جدید وسائل حمل و نقل اور ذرائع ابلاغ نے غالب لادینی تہذیب کو ایک ایک گھر میں گھسنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ان حالات میں جماعت کا کوئی ادنیٰ کارکن بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ تحریک اپنے بنیادی اصولوں اور نقشۂ کار میں کچھ ترک کرکے یا کچھ لچک پیدا کرکے اپنے نصب العین کی طرف پیش قدمی کر سکتی ہے۔

جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے' انہی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے' آج کے مرحلہ میں دعوت کے کام کو اپنے منصوبوں میں اولین ترجیح دی ہے۔ اور یہی ہدایت سارے کارکنوں کو کی ہے۔ صرف اولین ترجیح دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے' بلکہ دعوت الی اللہ کے بنیادی موضوعات واضح کیے ہیں' طریقوں کا تعیّن کیا گیا ہے' گھر گھر کو ہدف بنا کر دعوت پہنچانے کا پابند

کیا گیا ہے' وفود بنا کر اور دعوتی کیمپ لگا کر دعوت پہنچانے کا پروگرام دیا گیا ہے۔ ہر کارکن کو دو افراد ایک محنت کار کی طرح مسلسل زیرِ تربیت رکھنے اور اہلِ خانہ کی تربیت کے لیے ان کا اجتماع کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر ہم اپنے گھروں میں ایک اسلامی ماحول قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو نہ صرف افراد خانہ ایک دوسرے کے پشتیبان بنیں گے' بلکہ وہ اپنے ماحول میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔

عملی طور پر' تبلیغی لٹریچر کے ہزاروں سیٹ کارکنوں کو کم قیمت پر فراہم کیے گئے ہیں' اور آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے جدید ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اپنی تربیت' اور اقامتِ صلوٰۃ اور نماز باجماعت کی پابندی' اور محلوں میں توسیع دعوت کے مقاصد کے لیے فجر کی نماز میں حاضری' اور مساجد کے گرد احباب کے حلقے بنانے کا پروگرام دیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کارکن اس پورے منصوبہ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھیں' اور پچاسویں سال کے اختتام پر اس کو عملی جامہ پہنانے کا بھرپور عزم ایک دفعہ پھر تازہ کریں۔

عوام میں اثر و نفوذ کی تیز تر مساعی کے باوجود' تربیت کے ضمن میں معمول کے سارے پروگرام اسی طرح جاری ہیں جس طرح وقتاً فوقتاً وضع کیے جاتے رہے ہیں۔ مرکزی تربیت گاہ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ دائرہ تعلیم و تربیت کا آغاز کرکے ایک ایسی تربیت گاہ کے اس خواب کو بھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جارہی ہے جو دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے بہترین کارکن تیار کرے۔ (روداد اول' ص ۳۶) لیکن تربیت کی یہ ساری کوششیں کافی نہیں ہیں۔ ان کو تیز تر اور وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ پانچ سالہ منصوبہ میں جو بنیادی رہنما اصول طے کیے گئے ہیں اور جو طریقے تجویز کیے گئے ہیں' کارکنوں اور جماعتوں کو پورے اہتمام سے ان کا التزام کرنا چاہیے۔ خصوصاً ہر کارکن کو اپنی تربیت آپ کے اصول پر' سب سے بڑھ کر اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے۔ تربیت یافتہ کارکن ہماری تحریک میں مرکز و محور اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحریک کے لیے موجودہ مرحلے میں عوام کو سنبھالنے کے لیے باصلاحیت' تربیت یافتہ کارکنوں کی شدید ضرورت ہے۔

یہاں دعوت و تربیت کے ضمن میں یہ اعتراف ضروری ہے کہ ہدایات اور منصوبوں کے باوجود عملی کارکردگی میں بہت کوتاہیاں ہیں۔ مگر انسانوں میں عزائم' منصوبوں اور ہدایات اور ان پر عمل اور نتائج کے درمیان ہمیشہ تفاوت ہوا کرتا ہے۔ انسان عزم کا کچا ہے۔ یہ بات خامیوں'

کوتاہیوں اور سہل انگاریوں کے لیے وجہ جواز ہرگز نہیں بنائی جا سکتی۔ لیکن اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ تفاوت ہمیشہ رہا ہے۔ تعلیمِ بالغاں ہو' اعلیٰ درجہ کی تربیت گاہ کا قیام ہو' نئے نظامِ تعلیم کے مطابق مدارس اور اداروں کا قیام ہو' عملی و تحقیقی کام ہو' معیارِ ارکان کا معاملہ ہو' حلقہ متفقین کا وہ پروگرام ہو جو ۱۹۵۱ میں پنجاب کے پہلے انتخابات کے بعد وضع کیا گیا اور جسے قرار داد ماچھی گوٹھ کے ساتھ منسلک کیا گیا --- عزائم اور عمل کا تفاوت ہر جگہ موجود رہا ہے۔ یہ آج بھی موجود ہے۔لیکن اس تفاوت کے باوجود گزشتہ پچاس سال میں جماعتِ اسلامی نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی کرے گی۔

جماعت میں ارکان و وابستگان کے اخلاقی و دینی معیار کے گرنے کا مسئلہ بھی بار بار ذہنوں میں اُٹھتا ہے' اور اُٹھایا بھی جاتا ہے۔ یہ بحث بھی روزِ اول سے چلی آرہی ہے۔ رودادیں ارکانِ جماعت کی حالت پر شکایات سے بھری ہوئی ہیں۔ جائزہ کمیٹی نے تو ایسی تصویر کھینچی تھی--- آج سے ۳۵ سال قبل --- کہ مولانا مودودیؒ کو یہ کہنا پڑا تھا کہ "اگر ساری جماعت بحیثیت مجموعی بگڑ گئی ہے تو اسے توڑ دیجیے۔" پھر یہ بھی کہ "پوری جماعت کے متعلق --- ہر پہلو سے کامل طمینان کی رپورٹ شاید آپ کبھی نہ پائیں گے۔" آخری بات اُن کی اس ضمن میں یہ بھی اہم ہے کہ "میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فیصد ضمانت دیتا ہو۔" (آئندہ لائحہ عمل)---

لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ یہ باتیں جواز' تاویل اور غفلت کی بنیاد نہ بننا چاہییں ہاں' مایوسی سے بچنے اور رومانوی دنیا سے نکل کر حقیقت پسند بننے کے لیے ان کا ادراک ناگزیر ہے۔

جماعت کی پچاس سالہ ترقی کا راز جہاں اپنے نصب العین' بنیادی اصولوں اور نقشۂ کار کی پابندی میں مضمر ہے' وہاں یہ بات ثبات و تغیّر کے ان حکیمانہ اصولوں پر کاربند رہنے کا نتیجہ بھی ہے جن کی تعلیم قرآن و سنّت میں دی گئی ہے' اور جن کی توضیح مولانا مودودیؒ نے ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں بڑی تفصیل سے فرمائی۔ آج کے مرحلہ میں بھی جماعت اگر پیش قدمی کر سکتی ہے تو سی بصیرت' اور ثبات و تغیّر کی اسی حکمتِ عملی کو اختیار کرکے کر سکتی ہے جو مولانا مودودیؒ نے ختیار کی۔ جو جماعتیں یہ نہ سمجھ سکیں کہ کیا بدل سکتا ہے اور کیا نہیں بدل سکتا' جو ہر چیز بدلنے کو تیار ہوں یا ہر تبدیلی سے بدکتی ہوں' وہ اپنے مقصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہیں' اور اُن

کو زمانہ ایک داستانِ پارینہ بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔

پہلا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "تدابیر کا ردّ و بدل ایک دوسری چیز ہے، جسے بعض لوگ غلطی سے اصول کا ردّ و بدل قرار دے بیٹھتے ہیں۔" (آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۹)

دوسرا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "فطری طریقِ انقلاب کا یہ تصوّر کہ وہ کوئی لگا بندھا طریقہ ہے جو ہر جگہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ڈھنگ پر چلنا چاہیے، سراسر ایک غیر معقول تصوّر ہے۔" (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۵۸)

تیسرا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "ایک طریقِ کار کے بنیادی اصولوں اور حالات پر ان کے عملی انطباق کی مختلف اشکال کے درمیان فرق کرنا عقل مندی کا تقاضا ہے۔" (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۱۷)

چوتھا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "دنیا میں کوئی جماعت بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتی۔" (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۵۹)

پانچواں اصول یہ واضح کیا گیا کہ "خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں کو سخت مخالف و مزاحم ماحول میں سے اپنا راستہ نکالنا ہو، اُن کے لیے تو یہ ناگزیر ہے اور دانائی کا تقاضا بھی کہ اگر ایک وقت اُنھوں نے ایک تدبیر کو صحیح اور مناسب پا کر اختیار کیا ہو اور دوسرے وقت وہ تدبیر موزوں اور کارگر نہ رہے، تو وہ بلاتامّل اس کو کسی بہتر اور حالات کے لحاظ سے مناسب تر تدبیر سے بدل لیں۔" (آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۹-۶۰)

چھٹا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "دانائی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ حالات میں واقع ہونے والے اہم تغیّرات کا نوٹس لیا جائے اور بدلے ہوئے حالات کے لحاظ سے طریقِ کار میں ضروری ردّ و بدل سے گریز نہ کیا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۱۷)

ثبات و تغیّر کے ان اصولوں کا اطلاق ہم گزشتہ پچاس سال میں جس طرح کرتے رہے ہیں اس کا ایک مختصر جائزہ فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔

ہم طریقِ کار میں قرآن و سنّت کی ہدایات کے پابند ہیں۔ لیکن ہر صاحبِ علم آدمی یہ جانتا ہے کہ قرآن و سنّت کے احکام کی فہم و تعبیر میں بھی انسانوں کے درمیان اور مختلف زمانوں میں اختلاف و تبدیلی کا عمل جاری رہا ہے۔ یہی معاملہ ہمارے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ مثلاً تاسیسِ

جماعت کے وقت ہم نے یہ تعبیر اختیار کی کہ "علمِ کتاب و سنّت اور حکمتِ عملی دونوں کا اقتضا یہی ہے کہ ـــــ امیر کا انتخاب کسی مدّت کے ساتھ مقید نہ ہو۔" (روداد اول' ص ۳۰) بعد میں ہم نے اپنے دستور میں امیر کے انتخاب کو پانچ سال کی مدّت کے ساتھ مقید کیا۔

جب محترمہ فاطمہ جناح کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو' عورت کی سربراہی کو ناجائز سمجھنے کے باوجود' مرکزی مجلسِ شوریٰ نے طے کیا کہ "شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت میں تبدیل نہیں ہو سکتی' اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر' ضرورت کی حد تک' جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے" چنانچہ آمریت سے نجات پانے کی ضرورت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا گیا' مگر یہ واضح کر دیا گیا کہ نہ یہ فیصلہ آئندہ کے لیے نظیر ہو گا' نہ اس سے حکم کی شرعی نوعیت بدل سکتی ہے۔

ایک وقت یہ سوال بھی اُٹھایا گیا کہ اگر انتخابات صرف ایک لادینی دستور کے تحت ہی ممکن ہوں یا انتخابات کا دروازہ مسدود ہو' تو کیا ایسے انتخابات میں حصّہ لیا جا سکتا ہے (جو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہے) ' یا مسلّح انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظامِ حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی تامّل نہ ہو گا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریقے سے۔" اور اگر پُرامن ذرائع سے ممکن نہ ہو تو "ہم دعوتِ عام جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔" (آئندہ لائحہَ عمل' ص ۱۰۵-۱۰۶)

۱۹۴۷ میں قیامِ پاکستان کے بعد حالات میں جو عظیم تغیّر رُونما ہو گیا' مولانا مودودیؒ کی قیادت میں جماعت نے اس کا بروقت نوٹس لیا اور بدلے ہوئے حالات میں اپنے ابتدائی طریقِ کار میں ردّ و بدل کیا۔ مولانا مودودیؒ نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ کو لاء کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے ۴ نکاتی مطالبہَ نظامِ اسلامی پیش کیا' اور اسی طرح اگست ۱۹۵۲ میں مطالبہَ دستُورِ اسلامی پیش کیا۔ ان مطالبات کو منوانے کے لیئے جماعت نے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے عوام سے جذباتی اپیل بھی کی' اور عوامی جدّوجہد بھی شروع کر دی۔ "یوں ہماری تحریک نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔" (آئندہ لائحہَ عمل' ص ۱۴۰) بعد میں مرکزی مجلسِ شوریٰ نے' اور آٹھ سال بعد ارکان کے اجتماعِ عام نے اس دُور رس تبدیلی کی توثیق کر دی۔

مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں "ہم سخت نادان ہوتے اگر اس موقع کو ہاتھ سے کھو دیتے اور اپنے آپ کو قبلِ تقسیم ہی کی پوزیشن میں سمجھے بیٹھے رہتے۔" (آئندہ لائحۂ عمل، ص ۱۲۸) اور اگر "ہم ان حالات میں قبلِ تقسیم کے طریق پر ہی کام کرتے رہتے تو اپنے مقصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے۔" (آئندہ لائحۂ عمل، ص ۱۲۰)

ہم نے اپنے اپیل کے طریقے میں تبدیلی کی۔ ہم نے اپنے کام کے ڈھنگ میں تبدیلی کی۔ پہلے ہم دعوت کا کام چند متعین طریقوں سے بہت محدود پیمانے پر کر رہے تھے۔ اب ہم نے مطالبۂ نظامِ اسلامی کے وسیلے سے لاکھوں آدمیوں تک دعوت پہنچانے، اور ہزاروں کو اپنی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ مستحکم توسیع تو "دھیمی رفتار سے محدود پیمانے پر ہی ہو سکتی ہے۔" اور اس وقت تک کام اسی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس مستحکم مگر سست رفتار توسیع سے نئے حالات کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہ ہوتی کہ "بڑے پیمانے پر توسیع کے جو مواقع ہمیں حاصل تھے ان کو ہم چھوڑ دیتے، اور بجائے خود اس توسیع کے جو فوائد ہیں ان کو نظرانداز کر دیتے۔" اس طرح ہم نے اپنی پیش قدمی کی رفتار بھی تبدیل کی۔ کشمکش کی راہ پر تدریجی ارتقاء کے ساتھ بڑھتے بڑھتے ہم نے "دفعتہ" جدّوجہد کے مرحلے میں قدم رکھ دیا۔" اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دستورِ اسلامی کے مطالبہ پر کشمکش کا آغاز کر دیا۔" (آئندہ لائحۂ عمل، ص ۱۴۳-۱۴۶)

عوامی جدّوجہد کے میدان میں آئے تو ریزولیشن بھی پاس ہوئے، جلوس بھی نکلے، زندہ باد اور سیّدی سیّدی، مُرشدی مُرشدی کے نعرے بھی لگے، جھنڈے بھی بنے، ہار بھی پہنائے گئے، استقبالیے بھی دیے گئے، تھیلیاں بھی پیش کی گئیں، غلافِ کعبہ کا گشت بھی ہوا۔ اور بالآخر یومِ شوکتِ اسلام بھی منایا گیا۔ اور یہ سب کچھ مولانا مودودیؒ کی زیرِ قیادت ہوا، حالانکہ خود اُن کی یہ تحریر موجود تھی کہ ریزولیشن، جلوس، نعرے وغیرہ اس تحریک کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ فقیہ تھے، لکیر کے فقیر نہ تھے۔

ان میں سے کوئی تبدیلی بھی نہ اصول کی تبدیلی تھی، نہ بنیادی تبدیلی۔ لیکن بعض لوگ عمل درآمد کی ہر نئی شکل کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اصول بدل گئے اور جماعت اپنی راہ سے ہٹ گئی۔ ان کو بتایا گیا کہ "جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عملدرآمد کی شکلیں نہ بدل سکے اس کی مثال میرے نزدیک اسی عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں

پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔"

اس طرح جب مولانا مودودیؒ نے یہ سمجھا کہ جماعت کا نظام بوجوہ آنے والے دور کی ساری ضروریات کو اپنے اندر نہیں سمیٹ سکے گا' تو نہ صرف جماعت میں متفق کا درجہ بنایا گیا' بلکہ متبادل انتظامات بھی کیے گئے۔ طلبہ کے لیے علیحدہ تنظیم قائم ہوئی' جو نہ ہر سطح کے جماعتی نظم کے تحت تھی اور نہ قانوناً مرکز کے تحت۔ اس کے بعد' مزدوروں کے لیے' کسانوں کے لیے' اساتذہ کے لیے' اور کئی دیگر ضروریات کے لیے مختلف نظم قائم ہوتے چلے گئے۔ کسی کے بارہ میں یہ نہ سمجھا گیا کہ کوئی جماعت کے نظم کے متوازی نظم قائم کیا جارہا ہے۔ جب یہ سمجھا گیا کہ برائی بیباک اور جری ہو گئی ہے اور نیکی اور شرافت پست ہمّتی' بزدلی اور کمزوری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے' تو نہ صرف جماعت کے نظم کو اس صورتِ حال کے مداوا کے لیے تیار کیا گیا بلکہ ڈیموکریٹک یوتھ فورس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی ضمن میں غنڈہ گردی اور فواحش کے انسداد کے سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ "ہم صرف اخلاقی تلقین پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے' بلکہ معاشرہ کے شریف عناصر کو ان برائیوں کے مقابلے میں منظّم کر کے ان کے خلاف عملی جدّوجہد کرنا چاہتے ہیں۔" (آئندہ لائحۂ عمل' ص ۸۱) اس کے بھی یہ معنی نہ تھے کہ ہم آئینی و جمہوری ذرائع ترک کر کے تشدّد کی راہ پر گامزن ہو رہے تھے۔

کیونکہ ہمارا طریقِ کار ہمیں جمہوری و آئینی ذرائع کا پابند کرتا ہے' اور ہم نے انتخابات ہی کو تبدیلیٔ قیادت کے ذریعہ کے طور پر اختیار کیا ہے' اس لیے جمہوریت کے دفاع میں ہم ہمیشہ پیش پیش رہے' اور ہم نے ہمیشہ مارشل لاء کی مخالفت کی۔ مارشل لاء نے خواہ اسلام کے خلاف پوزیشن لی ہو یا اس کے حق میں' ہم نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ آمریت سے نجات پانے کے لیے ہم نے سہروردی' بھاشانی' مجیب الرحمٰن' ولی خان' جیسے لوگوں تک سے تعاون کرنے سے دریغ نہ کیا۔ یہ آمریت خواہ فوجی لبادے میں ہو' خواہ شہری لباس میں۔ جب مارشل لاء نے اسلام کے نفاذ کا نعرہ بلند کیا تو اس وقت بھی' مجلسِ شوریٰ کی قرار دادیں گواہ ہیں' ہم اس کے فریب میں نہ آئے' اور مسلسل بحالیٔ آئین و جمہوریت اور انعقادِ انتخابات کا موّقف اختیار کیے رہے۔

آج بھی کاروانِ دعوت و محبّت' پبلک ریلیاں' بڑے بڑے جلوس' اسلامی جمہوری اتحاد' پاسبان' وغیرہ وغیرہ --- یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جس کا ذکر مَیں نے اوپر کیا ہے۔ یہ تاریخ کا تسلسل ہے جو جاری ہے' اور جاری رہے گا۔ ۱۹۴۷ کے بعد بھی تبدیلیاں' نئی تدابیر' اور

ایک ہی اصول کے عمل کی بدلتی ہوئی شکلیں دیکھ کر کچھ لوگ مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے۔ ان کو نہ صرف ثبات و تغیّر کے درج بالا وہ چھ اصول سامنے رکھنا چاہییں جن کو مولانا مودودیؒ نے بیان فرمایا، بلکہ اُن کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنا چاہییں کہ ''تبدیلی کے معنی یہ نہیں کہ پہلے طریقے کو ہم نے بالکل ترک کر کے صرف اس دوسرے طریقے پر اعتماد کر لیا۔ اس توسیعی کوشش کے ساتھ ہم اپنے سابقہ طریقے کے مطابق استحکام کی سعی بھی کرتے رہے ہیں اور اس کی اہمیت و ضرورت ہماری نگاہوں میں علیٰ حالہٖ قائم ہے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۴۴)

آج کے مرحلہ میں ہماری تحریک کو جو بڑے بڑے چیلنج درپیش ہیں، جن بدلتے ہوئے حالات کا سامنا ہے، وہ ہماری بنیادی فکر کا منطقی نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ہم آئینی و جمہوری طریقوں، رائے عامہ کے تغیّر، اور انتخابات کے ذریعہ مطلوبہ انقلاب لانے کے پابند ہیں، اس لیے عامۃ المسلمین کو اپنے نصب العین کی حمایت میں کھڑا کر دینا ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ دنیا میں، اور خود ہمارے ملک میں، اصل غلبہ مغرب کی لادینی تہذیب اور استعماری قوتوں کو حاصل ہے، اس لیے ہمیں اسلامی تحریکات کے خلاف عالمی طاقتوں کے منصوبوں سے عہدہ برآء ہونے کے لیے منصوبہ بندی کرنی ہے۔ یہ ہمارے لیے دوسرا بڑا چیلنج ہے۔ ان دونوں باتوں کو مولانا مودودیؒ نے تحریک کے آغاز ہی میں بڑے خوبصورت انداز میں یوں واضح کر دیا تھا، ''ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہوتی رہیں گی اگر ان کے ساتھ ساتھ ان کی پُشت پر ایک مضبوط رائے عامہ بھی تیار نہ ہوتی جائے۔ جس طرح تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رُونما نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ عامۃ النّاس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہو سکے۔ ہمیں نہ صرف ہندوستان، بلکہ حتّی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانا ہوگی۔ کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہو سکتا جب تک وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عامہ اس کی تائید میں تیار نہ کر لی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک متاثر ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اُٹھ رہے ہیں، لاکھوں انسانوں کو ہماری پُشت پر اخلاقی و عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونا چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی

مصیبت برداشت کرنے میں تامّل نہ کریں۔ (روداد اول' ص ۶۶-۶۷)

کیونکہ صرف کسی ایک ملک میں' عالمی دعوت کے بغیر' انقلاب برپا نہیں ہو سکتا' خصوصاً آج کے جیٹ اور سیٹلائٹ کے دور میں' اور کیونکہ عالمی طاقتیں اسلامی تحریکات کو ناکام بنانے کے لیے عرصہ سے منصوبہ بندی کر رہی ہیں' اس لیے اس مرحلہ میں رفقائے جماعت کو بین الاقوامی صورتِ حال کا بھی پورا ادراک ہونا چاہیے۔

جن دنوں برّصغیر ہندوپاک میں جماعتِ اسلامی کی تحریک برپا ہو رہی تھی' اُنھی دنوں میں مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک حسن البنّا شہیدؒ کی رہنمائی میں مصروف عمل تھی۔ اس کے مقاصد وہی تھے جو جماعتِ اسلامی کے مقاصد تھے۔ طریقِ کار میں جزوی فرق موجود تھا' لیکن طریقِ کار کے اصول چونکہ قرآن و سنّت کی رہنمائی میں طے کیے گئے تھے اس لیے یہ کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔

جماعتِ اسلامی اور اخوان کی یہ دو تحریکیں ہی وہ تحریکیں ہیں جن کو اس وقت دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں "حرکۃُ الاُم" بنیادی تحریکیں یا Mother Movements قرار دیتی ہیں۔ الاستاذ المودودیؒ اور امام حسن البنّاؒ اس دور کی اسلامی تحریکوں کے دو مسلم رہنما ہیں۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کی جدید پڑھی لکھی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ کیونکہ جدید تعلیم یافتہ نسل کو ان تحریکوں کے لٹریچر میں اپنے تمام ذہنی سوالات کے جوابات مل گئے' اور انھیں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ اسلام موجودہ دور میں نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ ان تمام انسانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے جن سے جدید دور کے انسان کو سامنا ہے۔

نئی نسل کے اس طرح اسلامی تحریک کی طرف لپکنے کی وجہ سے مغرب کی استعماری قوتیں پریشان ہو گئیں۔ ان کی یہ پریشانی ان کے دانشوروں کی نگارشات' ان کے جرائد اور اخبارات' اور ان کی نشریات میں صاف جھلکتی ہے۔ اٹلی کے وزیر خارجہ سے "نیوز ویک" کے مشہور جریدے نے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا کہ اب جبکہ معاہدۂ وارسا کے ممالک مغرب کے لیے خطرہ نہیں رہے' تو نیٹو (NATO) کا فوجی معاہدہ کس کے خلاف ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمیں نیٹو کے بارہ ممالک کے درمیان پائی جانے والی یکجہتی کو برقرار رکھنا ہے تاکہ اگر مستقبل میں مسلمان ممالک یورپ کے لیے خطرہ بنیں تو اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔

لندن کے مشہور جریدہ "اکنامسٹ" نے ایک مسلمان عالمِ دین اور ایک عیسائی پادری کا فرضی مکالمہ شائع کیا' جس میں "یورپ" کو آنے والے اسلامی خطرے سے خبردار کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔

امریکہ کے "ٹائم میگزین" نے امریکہ کے تین سو ارب ڈالر کے سالانہ دفاعی بجٹ پر بحث کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ روس کی پسپائی کے بعد یہ دیوہیکل دفاعی بجٹ کس کے خلاف ہے' تو اسے بھی مستقبل میں مسلمانوں کا خطرہ نظر آیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کو اس اسلامی دنیا سے کیا خطرہ ہے جو چالیس سے زیادہ ٹکڑیوں میں منقسم ہے' اور یہ چھوٹی ٹکڑیاں بھی آپس میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ بیشتر ٹکڑوں پر ایسی حکومتیں جو استعماری مصلحتوں کے تابع ہیں۔ ان ممالک کے زیادہ تر وسائل مغربی تہذیب و ثقافت کی ترویج اور اسلامی تہذیب کی بیخ کنی پر صرف ہو رہے ہیں۔ ان کی معاشی منصوبہ بندی استعماری قوموں کے مفادات کے تابع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خطرہ موجودہ حکمرانوں سے نہیں ہے۔ خطرہ اس سے ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں ایک مضبوط توانا اسلامی تحریک پورے اعتماد اور عزم سے پیش قدمی کر رہی ہے۔ اسلامی تحریک نے قربانی کی تاریخ میں ایک لازوال باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد کے بل بوتے پر اس نے افغانستان میں دنیا کی دوسری بڑی جنگی قوت کو پسپائی پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کی استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر رہی ہے اور افغانستان سے روس کے نکلنے کے بعد امریکہ کو قطعاً یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ نئے رنگ میں انہیں غلامی کی زنجیریں پہنا سکیں۔

کشمیر کے مجاہدین نے غلامی کی صدیوں پرانی جکڑ بندیوں کو توڑ دیا ہے۔ وہ' خالص اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر' تھوڑے ہی عرصے میں اتنی زبردست تحریک شروع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ بھارت کو اپنے اٹوٹ انگ کی تقسیم کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ فلسطینیوں نے' "حماس" کے زیرِ اہتمام' اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر' انتفاضہ کی تحریک شروع کر دی ہے' اور سیکولرزم کے جال کو توڑ دیا ہے۔ الجزائر اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک کی اسلامی تحریکوں نے نئی آب و تاب پیدا کی ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں سب سے زیادہ امید افزا تبدیلی وسط ایشیا میں آئی ہے۔ ہزاروں مقفّل مساجد کو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر کھول دیا ہے۔ مقبوضہ مدارس کو پھر سے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ تازہ تازہ وسط ایشیا سے لوٹنے والوں کا مشاہدہ ہے کہ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی ہیں' اور عشاء کے بعد جب بچے مسجدوں میں قرآن سیکھنے کے لیے جاتے ہیں تو تل دھرنے کو جگہ

نہیں ملتی۔ یہ اس علاقے کی صورتِ حال ہے جہاں آج سے دس سال پہلے ہمیں چند ایسے مسلمان بھی بڑی تلاش سے ملتے تھے جو روسی زبان میں ترجمہ کیا ہوا ہمارا لٹریچر قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

عالمِ اسلام میں یہ بیداری اچانک بلا سبب وجود میں نہیں آگئی۔ اس کی پُشت پر اسلامی تحریکوں کی طویل جدّوجہد کارفرما ہے۔ خود اپنے معاشرہ میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس بیداری میں ہمیں اسلامی تحریکوں کے دوش بدوش چلنا ہے۔

اپنے معاشرہ میں ہمارا اصل ہدف کیا ہے؟ مولانا مودودیؒ کے ارشاد کے مطابق' ''انقلابِ قیادت کی جدّوجہد' یعنی ''سیاست'' کوئی عارضہ نہ تھا جو جماعتِ اسلامی کو قیامِ پاکستان کے بعد کسی وقت یکایک لاحق ہو گیا--- میں بلا خوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دراصل یہی وہ امتیازی وصف ہے جو زمانۂ قریب کی تاریخ میں' کم از کم برِّعظیم ہند کی حد تک' جماعتِ اسلامی کی تحریک کو دوسری تحریکوں سے ممیّز کرتا ہے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۸۵۔ ۸۶) دعوت ہو یا تنظیم' تربیت ہو یا اصلاح معاشرہ ''یہ سارے کام کرنے کا فائدہ کیا ہے اگر آپ ان کاموں سے حاصل ہونے والے نتائج کو اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ساتھ ساتھ استعمال نہ کرتے چلے جائیں۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۷۰)

آپ خود سوچیے کہ اگر یہ ہدف آئینی و جمہوری ذرائع سے حاصل ہونا ہے' انتخابات کے ذریعہ ہونا ہے تو وسیع پیمانے پر رائے عامہ کو اپنے ساتھ لینے کے علاوہ مقصد تک پہنچنے کا راستہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد ہی وہ عوامی تحریک برپا کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی' جو اس سے پہلے مدّھم اور سُست مگر مستحکم توسیع کے کام کی خاطر مؤخر کی جا رہی تھی۔ اب ہمیں اس تحریک کو آگے ہی بڑھانا ہے۔ پیچھے دیکھنے یا پلٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انقلاب کے لیے ہر زمانے میں ذرائع اور مواقع اور حالات کے لحاظ سے مسلسل جدّوجہد کی جاتی رہی ہے۔ آج کے حالات کے لحاظ سے بھی ماضی کے ورثہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے' اسی جدّوجہد کو ہمیں آگے بڑھانا ہے۔

اس مقصد کے لیے ہمیں لٹریچر' تقریر' تعلیم' زبانی گفتگو' جلسے' جلوس' ریلی' نمائش' کیسٹ' ویڈیو' میلے' بازار' گویا تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر کام کرنا ہے۔ عوام کو اسلامی نظام کی

حمایت میں ایک ایسی منظم قوت بنا دینا ہے "جو دفاع اور ہجوم دونوں کا بل بوتا رکھتی ہو۔" اس مقصد کے لیے ہمیں زندگی کے بھڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل دینا ہو گا' اور مخالف تحریکوں اور طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی بھی کرنا ہوگی۔ اگر ہم نے ان مسائل میں دخل دینے اور مخالفین کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے گریز کیا تو مطلوبہ تغیّر کی رفتار بہت سست رہے گی۔

یہ عوامی تحریک خوُد ایک دعوتی کام ہے۔ بعض لوگ دعوت کا کام صرف وہ شمار کرتے ہیں جس پر دعوت کا عنوان لگا ہو۔ وہ کام جن پر سیاست یا عوامی تحریک کا عنوان چسپاں ہو' وہ اسے سیاسی ہڑبونگ کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس عنوان کے تحت دعوت کا بھی کوئی کام ہوا ہے۔ مگر مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں' "آپ ہزار کتابیں لکھ کر [یا پڑھ کر] بھی اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ جس وقت کوئی اہم مسئلہ لوگوں کے سامنے درپیش ہو اس وقت میدان میں آکر اس مسئلے میں ان کو صحیح رہنمائی دیں۔" (آئندہ لائحۂ عمل' ص ۱۲۷-۱۲۸)

ملک کے اندر تحریک کو آج جو بہت بڑا چیلنج درپیش ہے وہ مولانا مودودیؒ کے درج بالا ارشاد کے دوسرے حصّہ سے متعلق ہے۔ یعنی یہ کہ' پاکستان بننے کے بعد ہم نے ایک مسلم معاشرہ کے عوام میں تحریک برپا کرکے جس حد تک کام کر لیا ہے' اب اس کو کس طرح آگے بڑھائیں کہ اپنی اصل منزل تک پہنچ سکیں؟ دوسرے الفاظ میں' ۵۰ سال کی کاشت کاری کے ذریعہ ہم نے ہزاروں انسانوں کی جو فصل تیار کی ہے' اور جس کا عشر عشیر بھی ابھی اصل مقصد کے لیے کام نہیں آرہا' اس کو کام میں لگا کر اس مسلم معاشرہ کی معتدبہ تعداد کو کس طرح انقلابِ امامت کے مقصد کے لیے متحرک کر دیا جائے۔

۱۹۵۷ کے لائحۂ عمل کا ایک حصّہ یہ بھی رہا ہے کہ "ہمارے معاشرہ میں جو ایک بچا کھچا صالح عنصر موجود ہے' مگر منتشر ہونے کی وجہ سے یا جزوی اصلاح کی پراگندہ کوشش کرنے کی وجہ سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر رہا ہے' اسے چھانٹ چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کیا جائے' اور ایک حکیمانہ پروگرام کے مطابق اس کو اصلاح و تعمیر کی منظم سعی میں لگا دیا جائے۔" اور اب تو اس صالح عنصر میں خوُد ہمارے وابستگان کی ایک کثیر تعداد بھی شامل ہے۔ حلقۂ متّفقین کا پروگرام اسی غرض کے لیے تھا' لیکن تقریباً ۳۵ سال میں بھی وہ قابلِ ذکر حد تک عملی جامہ نہیں پہن سکا۔ اب مرکزی مجلسِ شوریٰ کی طے کردہ پاسبان کی اسکیم بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لیے شروع کی گئی ہے۔ ہمیں اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کرنا ہے۔

عوامی تحریک کا ایک اہم جُز عورتوں کا حلقہ ہے۔ وہ ہماری آبادی کا نصف حصّہ ہیں۔ عورتوں کی راہ سے بگاڑ بھی تیزی سے آرہا ہے۔ انہی کے ذریعہ اصلاح کی رفتار بھی تیز تر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ہم کو ایک ہی لگے بندھے طریقے سے کام کرنے کے بجائے حالات کے لحاظ سے موزوں تدابیر وضع کرنا ہوں گی۔

یہ سارا کام جماعت کی تنظیم میں محبت و الفت' سمع و طاعت' اور مشاورت و احتساب کے نظام کا متقاضی ہے۔ تمسخر' تنابز بالالقاب' بدظنی' تجسّس' غیبت' ہمز' لمز' بلا تحقیق نقل وغیرہ رذائل سے پاک ہو کر چلنا ہو گا۔ ایک دوسرے کے لیے عزّت' احترام' محبت' الفت اور ذکرِ خیر کی صفات کو پروان چڑھانا ہو گا۔ خدا کا شکر ہے کہ جماعت میں اطاعت' شورائیت اور احتساب کا نظام اپنا کام کر رہا ہے۔ لیکن ان اخلاقی فضائل ورذائل کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

تحریکِ اسلامی کے چار نکاتی لائحہ عمل کا یہ فطری تقاضا ہے کہ جوں جوں عوام ہمارے ساتھ آئیں گے' اور ہم انقلابِ قیادت کی منزل کے قریب پہنچیں گے' اس کی گہما گہمی میں اضافہ ہو گا۔ ہمیں عوامی پذیرائی حاصل ہو گی تو مسائل پیدا ہوں گے۔ ہمارے مستحکم توسیعی اور تربیتی کام کو اس گہما گہمی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اس گہما گہمی سے گھبرانا بھی نہیں چاہیے' کیونکہ ابتدا ہی سے ہم نے ان کے درمیان توازن پیدا کر کے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے ہم پوری دلجمعی سے دعوت الی اللہ کا کام کریں' عوام کو ساتھ لائیں' جو لوگ قریب آئیں ان کی وسیع پیمانہ پر دینی اور اخلاقی تربیت کا انتظام کریں' اور انہیں منظم کریں۔ پھر اس پوری قوت کو اصلاحِ معاشرہ کے کام پر لگا دیں' اور عوامی بیداری پیدا کر کے انقلابِ قیادت کا راستہ ہموار کریں۔ ایک کام کی وجہ سے دوسرا کام ترک نہ کریں۔ کاموں میں کمی بیشی ہو سکتی ہے' تقسیمِ کار ہو سکتی ہے' دوسرے تنظیمی ڈھانچے بن سکتے ہیں' لیکن لائحہ عمل کے کسی جُز کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ایسا ہونا چاہیے' نہ یہ غلط مفروضہ قائم کرنا چاہیے کہ اگر عوامی کام ہو رہا ہے تو اس کے متوازی تعمیری مساعی کو ترک کیا جا چکا ہے۔

الحمد للہ ہم پچاس سال سے اس طریقِ کار کے مطابق اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ منزل جوں جوں قریب آتی ہے' شوقِ منزل بڑھتا ہے اور رفتار میں اضافہ ہوتا ہے۔

تیز تر گام زن منزلِ ما دور نیست